© rasailojaraid.com

بحث و نظر

اسلامی معاشیات

جناب مولانا محمد طاسین صاحب، کراچی

مشینوں پر زکوٰۃ

ماہنامہ بیّنات شمارہ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ میں زیر عنوان "مشینوں اور فیکٹریوں کی زکوٰۃ" ایک عربی عبارت بغیر ترجمہ شائع ہوئی ہے جو محترم ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب نے کوالالمپور سے بیّنات کو بغرض اشاعت بھیجی ہے۔ شروع میں لکھا ہے کہ یہ عبارت جناب یوسف القرضاوی صاحب کی کتاب فقہ الزکوٰۃ سے لی گئی ہے۔

مقصد اس عبارت کو بھیجنے اور شائع کرنے کا یہ ہے کہ قارئین بیّنات کو یہ معلوم ہو جائے کہ موجودہ دور کے ایک نامور فقیہ جناب یوسف القرضاوی صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ کارخانوں کے مشینی سرمائے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور یہ کہ جن دلائل کی بنیاد پر موصوف کی یہ رائے ہے وہ ان کی اس عربی عبارت میں مذکور ہیں۔

جیسا کہ قارئین بیّنات کو معلوم ہے کہ مجھے اس مسئلہ سے دلچسپی ہے اور میں اس کے متعلق اپنے علم و فہم کے مطابق کافی لکھ چکا ہوں، اس سلسلہ کے میرے دو مضمون بیّنات میں شائع ہو کر قارئین بیّنات کی نظر سے گذر چکے ہیں اور تیسرا جو اسی سلسلہ کی ایک خاص کڑی تھا، بیّنات کی بجائے ماہنامہ الولی شمارہ مارچ ۷۴ء میں شائع ہوا جو شاہ ولی اللہ اکاڈمی حیدرآباد سندھ کی طرف سے نکلتا ہے۔ میں نے اس مسئلہ کے متعلق اب تک جو کچھ پڑھا، سوچا اور سمجھا ہے۔ اس کی بنا پر میری ناچیز رائے یہ ہے کہ کارخانوں اور خاص طرح کی کرائے پر چلائی جانے والی کمرشل بلڈنگوں کے سرمائے پر اسی طرح زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس طرح دوسرے کسی تجارتی سرمائے پر عائد ہوتی ہے۔ اور جن دلائل کی بنیاد پر میری یہ رائے ہے۔ میں ان کو اپنے مضامین میں پیش کر چکا ہوں۔ اسی طرح میں ان دلائل پر بھی بحث کر چکا ہوں جو ان حضرات کی طرف سے اب تک سامنے آئے ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ سرمائے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، میرا مقصد تحقیق حق ہے۔ لہٰذا کسی وقت بھی جس کی طرف سے بھی میرے سامنے کوئی ایسی دلیل آئے گی جس سے میری رائے کا غلط اور دوسرے حضرات کی رائے کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہوگا، میں اپنی رائے سے رجوع کا اعلان کر دوں گا۔

محترم یوسف القرضاوی صاحب نے اس عبارت میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں۔ بغور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کا تعلق فقہی اصولوں سے کم اور وقتی مصالح سے زیادہ ہے اور عقلی و منطقی طور پر اتنے کمزور ہیں کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، فریق بحث ہونے کی حیثیت سے ضروری معلوم ہوا کہ ان دلائل پہ کچھ اظہار خیال کیا جائے اور بتلایا جائے کہ ان دلائل میں کہاں اور کیا سقم اور ضعف ہے۔ اور کیوں قابل اعتماد نہیں ——۔

پہلی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ زکاۃ چونکہ عروض تجارت پر واجب ہوتی ہے اور عروض تجارت کی تعریف ہے: کُلُّ مَا أُعِدَّ لِلْبَیْعِ مِنَ الْأَشْیَاءِ بِقَصْدِ الرِّبْحِ۔ وہ تمام چیزیں جو نفع کی غرض سے بیچنے کے لئے تیار کی گئی ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ کارخانے میں لگی ہوئی مشینیں اور کرائے پر چلائی جانے والی عمارتیں بیچنے اور فروخت کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ لہٰذا وہ عروض تجارت کی مذکورہ تعریف میں نہیں آتیں، جب عروض تجارت کی تعریف میں نہیں آتیں تو پھر ان پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوتی۔

اس پہلی دلیل میں جو کمزوری اور خرابی ہے وہ یہ کہ اس کی بنیاد عروض تجارت کی جس تعریف پر قائم ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ اس تعریف میں تجارت کو بیع کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بیع خاص اور تجارت عام ہے۔ بیع کا اطلاق صرف اس معاشی معاملے پر ہوتا ہے جس میں بصورت خرید و فروخت مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے، بخلاف تجارت کے کہ اس کا اطلاق معاملہ بیع پر بھی ہوتا ہے۔ اور کاروبار کی ان دوسری شکلوں پر بھی ہوتا ہے جن میں [illegible] کے ساتھ محنت کر کے نفع کمایا جاتا ہے۔ لہٰذا تجارت کا صحیح ترجمہ بزنس اور دھندا ہے۔ تجارت اور بیع کے درمیان عام اور خاص کا جو فرق ہے۔ اس کا اظہار قرآن حکیم کی بعض آیات سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہ آیت: رِجَالٌ لَّا تُلْهِیهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَیْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ، وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں نہ تجارت اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کرتی ہے اور نہ بیع، اس آیت میں تجارۃ معطوف علیہ اور بیع معطوف ہے۔ اور چونکہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس آیت کی تفسیر میں مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ یہاں وہ مغایرت عام و خاص کی ہے، تفسیر قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں اس آیت کے شان نزول کے متعلق ایک روایت بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

إن رجلين كانا في عهد النبي صلى الله عليه وسلم أحدهما بياعاً فاذا سمع النداء بالصلاة فإن كان الميزان بيده طرحه ولا يضعه وضعاً وإن كان بالأرض لم يرفعه وكان الآخر قيناً يعمل السيوف للتجارة فكان اذا كانت مطرقته على السندان ألقاها موضوعة وإن كان قد رفعها ألقاها من وراء ظهره إذا سمع الأذان فأنزل الله تعالى هذا ثناء عليهما وعلى كل من اقتدى بهما. ص ۲۷۹ ج ۱۲ تفسیر القرطبی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو شخص تھے۔ ایک خرید و فروخت کرنے والا دوکاندار، جب وہ اذان سنتا تو فوراً ترازو کو ہاتھ سے پھینک دیتا اور اس کو اپنی جگہ ٹھیک طریقہ سے بھی نہ رکھتا، اور اگر ترازو زمین پر ہوتا تو اس کو نہ اٹھاتا، اور دوسرا لوہار تھا جو تجارت کیلئے تلواریں بناتا تھا، جب اذان سنتا تو اگر ہتھوڑا سندان پر ہوتا تو اس کو وہیں رکھ دیتا اور اگر ہاتھ میں اٹھائے ہوتا تو پیٹھ پیچھے ڈال دیتا، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان کی مدح و تعریف میں نازل فرمائی اور جو ان کی پیروی کرنے والے تھے انکی مدح میں۔

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کاریگر اور صنعت کار کمانے کی غرض سے جو پیشہ ورانہ صنعت کرتا ہے اس پر بھی تجارت کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا تجارت اور بیع کو ہم معنٰی قرار دینا غلط ہے۔ تجارت عام اور بیع خاص ہے اس کی تشریح علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں آیت إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں: "فتدخل في قوله تعالى إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ عقود البياعات والاجارات والهبات المشروطة فيها الاعواض۔" پھر کچھ آگے نہایت وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں "إن اسم التجارة أعم من اسم البيع لأن التجارة ينتظم عقود الاجارات والهبات الواقعة على الاعواض والبياعات۔" ان عبارتوں سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ علامہ جصاص کے نزدیک تجارت عام اور بیع خاص ہے۔

فقہ حنفی کی کتاب جامع الرموز میں تجارت کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ "التجارة هي التصرف في المال للربح" تجارت نام ہے نفع کے لئے مال میں تصرف کرنے کا۔ درالمختار میں تجارت کی جو تعریف ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "عقد التجارة هو كسب المال بالمال بعقد الشراء أو اجارة أو استقراض" عقد تجارت نام ہے مال کے ذریعے مال کمانے کا عام ہے کہ وہ معاملہ بیع و شراء کے طریقہ سے ہو یا اجارے کے طریقہ سے یا استقراض کے طریقہ سے۔

فقہ شافعی کی کتاب تحفۃ المحتاج میں تجارت کی تعریف یہ لکھی ہے۔ التجارة هي تقليب المال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالتصرف فیہ لمقصد الربح اھ" اس پر علامہ عبدالحمید الشروانی نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مغنی المحتاج، اسنی المطالب اور النہایہ میں تجارت کی تعریف یہ ہے: "التجارة تقلیب المال بالمعاوضة لغرض الربح" اور پھر دونوں میں تطبیق دینے کے لئے فرمایا: "اذ المراد بالتصرف فیہ للبیع ونحوہ من المعاوضات" فقہاء کرام کی ان تعریفوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ تجارت کو عام اور بیع کو خاص سمجھتے ہیں۔

کتب لغت میں سے تاج العروس میں تجارت کی تعریف جن الفاظ سے کی گئی ہے وہ یہ ہے:

"التجارة تقلیب المال لغرض الربح" تجارت نام ہے نفع کی غرض سے مال میں الٹ پھیر کرنے کا۔

مفردات امام راغب میں تجارت کی تعریف یوں الفاظ کی گئی ہے: "التجارة التصرف فی رأس المال طلبا للربح" تجارت رأس المال میں اس تصرف اور ردوبدل کا نام ہے جو نافع کی غرض سے ہو۔ واضح رہے کہ بعض کتابوں میں تجارت کی تعریف "مبادلة المال بالمال" سے جو کی گئی ہے وہ تجارت کی ایک مشہور و معروف قسم کی تعریف ہے جس کا دوسرا نام بیع ہے۔ کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے جب تجارت کا لفظ بولا جاتا ہے تو فوراً ذہن اسی طرف منتقل ہو جاتا ہے گویا کہ تجارت نام ہی خرید و فروخت کا ہے حالانکہ باعتبار اصل حقیقت کے ایسا نہیں اصل کے اعتبار سے تجارت بمنزلہ جنس اور بیع بمنزلہ اس کی ایک نوع کے ہے۔

تجارت سے متعلق کتب تفسیر، فقہ اور لغت سے یہ تفصیل عرض کی گئی ہے۔ اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جناب یوسف القرضاوی صاحب نے اپنی پہلی دلیل کی بنیاد عروض تجارت کی جس تعریف پر رکھی ہے وہ صحیح نہیں لہٰذا جب ان کی دلیل صحیح نہیں تو پھر اس کا نتیجہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

محترم قرضاوی صاحب نے عروض تجارت کی تعریف کے ساتھ جو حدیث بطور دلیل ذکر کی ہے۔ اگر وہ اس لئے ذکر کی ہے کہ اس سے یہ تعریف مطلق اور ثابت ہوتی ہے تو یہ بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ عروض تجارت صرف وہ اشیاء ہیں جو بغرض بیع فروخت کے لئے متعین کر دی گئی ہوں اور ان کے سوا باقی اشیاء عروض تجارت میں داخل نہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یامرھم ان یخرجوا الزکاة مما نعد للبیع۔ ان الفاظ سے اگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے جو بیع کے لئے تیار کی گئی ہوں چونکہ اس حدیث میں حصر کا کوئی صیغہ موجود نہیں جس سے باقی چیزوں پر زکوٰۃ کی نفی ہوتی ہو لہٰذا اس حدیث سے یہ مطلب لینا درست نہیں کہ زکوٰۃ صرف ان چیزوں پر واجب ہے جو فروخت کے لئے تیار کی گئی ہوں ان کے سوا باقی چیزوں پر واجب نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں اگر کسی کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے تو وہ اس حدیثِ نبوی کو اس کے ثبوت میں بطورِ دلیل پیش کر سکتا ہے کیونکہ جو مال فروخت کے لئے تیار کیا گیا ہو وہ چونکہ مالِ تجارت کی ایک قسم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہونے سے مطلق مالِ تجارت پر زکوٰۃ کا واجب ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں تو کسی کو کوئی اختلاف ہی نہیں سب مانتے ہیں کہ مالِ تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اختلاف جس بات میں ہے وہ یہ کہ کون کون سے اموال، مالِ تجارت میں شامل ہیں اور کون سے شامل نہیں، سو اس کے متعلق اس حدیث میں کوئی تفصیل نہیں لہٰذا اس حدیث کو یہاں ذکر کرنا بے محل و بے موقع ہے۔

علاوہ ازیں اگر اس حدیث پر فقیہانہ انداز سے غور کیا جائے تو اس سے الٹا ان اموال پر بھی زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہوتا ہے جن کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینے کے لئے محترم قرضاوی صاحب نے یہ حدیث ذکر فرمائی ہے، وہ اس طرح کہ اس حدیث میں اموالِ بیع پر وجوبِ زکوٰۃ کا جو حکم ہے اس کی علّت اگر یہ مانی جائے کہ ایسا مال چونکہ اپنے مالک کی حاجتِ اصلیہ سے فاضل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ جیسا کہ فقہاء کی رائے ہے، یا اس کی علت یہ قرار دی جائے کہ ایسا مال چونکہ نامی ہوتا ہے۔ یعنی "کون المال معداً للاستنماء" کے تحت آتا ہے۔ جیسا کہ حنفی فقہا کی رائے ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ٹھہرائی گئی ہے، بہرحال پہلی علت ہو یا دوسری دونوں علتیں زیرِ بحث مال میں پائی جاتی ہیں۔ وہ مالک کی حاجتِ اصلیہ سے فاضل بھی ہوتا ہے۔ اور نامی بمعنے معداً للاستنماء بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے بطریقِ قیاس زیرِ بحث اموال پر بھی زکوٰۃ کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد اب جناب قرضاوی صاحب کی دوسری دلیل کو لیجئے، جس کو منطقی اسلوب سے بیان کیا جائے تو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "اگر ہر اس سرمائے کو مالِ تجارت قرار دیا جائے جس کو اس کے مالک نے نفع کمانے اور اپنا تموّل بڑھانے کی غرض سے کسی کاروبار میں لگا رکھا ہو تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مزروعہ زمین پر بھی اس کی قیمت کے لحاظ سے ہر سال زکوٰۃ واجب ہو کیونکہ اس صورت میں مزروعہ زمین بھی مالِ تجارت کی تعریف میں آ جاتی ہے، حالانکہ یہ لازم باطل ہے اس لئے کہ شرعی نصوص سے صاف ثابت ہے کہ زرعی زمین پر اس کی قیمت کے لحاظ سے ہر سال زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیداوار پر عشر کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز باطل کو مستلزم ہو وہ باطل ہوتی ہے لہٰذا مالِ تجارت کی مذکورہ تعریف باطل ہے۔"

اس دلیل سے مقصود دراصل مالِ تجارت کی اس تعریف کو باطل اور غلط ثابت کرنا ہے۔ جس کی رو سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیرِ بحث مشینی اور عمارتی سرمائے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس دلیل سے ہرگز یہ مقصود ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ دلیل جس مفروضے پر مبنی ہے وہی سرے سے غلط ہے۔ مطلب یہ کہ مالِ تجارت کی مذکورہ تعریف کو صحیح مان لینے سے وہ باطل لازم ہی نہیں آتا جس کی وجہ سے اس تعریف کو غلط اور باطل ثابت کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ کہ اگر اس دلیل میں زمین سے مراد وہ زمین ہے جس میں ایک کاشتکار خود محنت کر کے روزی کماتا اور اس پر وقت گزارتا ہے۔ گویا اپنی معیشت کے لئے اس زمین کا محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے تو ایسی زمین مالِ تجارت کی مذکورہ تعریف میں نہیں آتی کیونکہ اس میں یہ قید ہے کہ جو مال مزید بڑھانے اور اپنے تمول میں اضافہ کرنے کی غرض سے کسی کاروبار میں لگایا گیا ہو وہ مالِ تجارت ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا مال وہی ہو سکتا ہے۔ جو مالک کی حاجاتِ اصلیہ سے فاضل ہوتا ہے۔ بخلاف مذکورہ زمین کے کہ وہ تمول اور غنا کو بڑھانے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ ضروریات حاصل کرنے اور وقت گزارنے کے لئے ہوتی ہے۔ گویا اس کی حیثیت ان چیزوں کی سی ہوتی ہے جو حوائجِ اصلیہ میں داخل ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب یہ زمین مالِ تجارت کی تعریف میں ہی نہیں آتی۔ تو پھر اس پر مالِ تجارت کی طرح زکوٰۃ واجب ہونا کیسے لازم آسکتا ہے۔ دراصل ایسی زمین اس آلے اور مشین کی طرح ہے جس کے ساتھ کوئی کاریگر خود کام کر کے رزق و مال کماتا ہے، یا اس کرائے کے مکان کی طرح ہے جس کی آمدنی پر وہ گذر بسر کرتا ہے۔ رہ گیا جس سے مقصود اپنی فاضل دولت کو بڑھانا اور بنک بیلنس میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی نگرانی اور دیکھ بھال وغیرہ کر کے اس کی آمدنی سے ضروریات پورا کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح اس مشین پر زکوٰۃ واجب نہیں جس کے ساتھ کاریگر خود کام کر کے کمائی کرتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی زیادہ قیمت کی کیوں نہ ہو، اور جس طرح اس مکان پر زکوٰۃ نہیں جو ضروری ذریعہ معاش کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی زیادہ قیمت کا کیوں نہ ہو اسی طرح اس خطۂ زمین پر بھی زکوٰۃ نہیں جس کو کوئی شخص خود کاشت کر کے اس کی پیداوار پر گزارہ کرتا ہے۔

اور اگر اس دلیل میں ارض سے مراد وہ طویل و عریض خطۂ ارضی ہے جس کو ایک غنی شخص اپنے فاضل مال سے اس لئے خریدتا اور ماہرین وغیرہ کی مدد سے اس میں زرعی فارم قائم کرتا ہے کہ اپنے مال کو بڑھائے اور اپنے تمول میں مزید اضافہ کرے تو ایسی اراضی یقیناً مالِ تجارت کی مذکورہ تعریف میں آتی اور اس پر بلحاظ قیمت مالِ تجارت کی طرح زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شرعاً کوئی خرابی نہیں کیونکہ قرآن و حدیث اور فقہ میں زرعی زمین پر عشر کے متعلق جو نصوص ہیں وہ پہلی قسم کی زمین سے متعلق ہیں اس دوسری قسم کی زمین سے متعلق نہیں، اس لئے کہ عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ اور عہدِ تدوینِ فقہ میں اس دوسری قسم کی زمین یعنی زرعی فارموں کا وجود ہی نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مزارعت وغیرہ سے منع فرما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا تھا اور زراعت کی بجائے تجارت کی ترغیب فرمائی تھی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ بڑی بڑی زرعی فارم جن میں مشینوں کے ذریعے ماہرینِ زراعت اور زرعی مزدور کام کرتے ہیں اور جن میں لاکھوں کا سرمایہ خرچ کر کے بکثرت نفع کمایا جاتا ہے اور ان سے مقصود اپنی دولت میں اضافہ کرنا اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے دورِ جدید کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا ان پر ان شرعی نصوص کو منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ جو پہلی قسم کی اراضی سے متعلق ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان نئی قسم کی زرعی اراضی پر بھی زکوٰۃ کا مسئلہ اسی طرح کا نیا مسئلہ ہے۔ جس طرح کہ کارخانوں اور خاص طرح کی عمارتوں پر زکوٰۃ کا مسئلہ ایک نیا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس کو بھی اسی طرح حل کرنے کی ضرورت ہے جس طرح کہ زیرِ بحث کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال اس دوسری دلیل سے نہ تو مالِ تجارت کی مذکورہ تعریف غلط اور باطل قرار پاتی ہے۔ اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیرِ بحث سرمایۂ زکوٰۃ کے تحت نہیں آتا، گویا دلیل اور دعوے کے مابین کوئی عقلی ربط یا تعلق ہی نہیں۔

اب اس تیسری دلیل کی طرف آئیے جو محترم قرضاوی صاحب نے زیرِ بحث مشینی اور عمارتی سرمائے کو زکوٰۃ سے خارج کرنے کے لئے پیش فرمائی ہے۔ اس دلیل میں جو کھوکھلا پن ہے، اُسے واضح کرنے سے پہلے ایک اصولی بات عرض کر دینا ضروری ہے جو قانون سازی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ قانون کا تعلق ہمیشہ کسی شئے کے اُن حالات و کوائف سے ہوتا ہے جو عموم و کثرت کے ساتھ اس سے ظہور میں آتے ہیں، اس میں اس شئے کے اُن حالات کا اعتبار نہیں ہوتا جو اس سے شاذ و نادر اور اتفاقاً کبھی ظہور میں آتے ہیں ورنہ تو پھر کسی شئے کے متعلق کبھی کوئی قانون بن ہی نہ سکتا، کیونکہ ہر شئے میں کچھ نہ کچھ ایسی شکلیں ضرور موجود ہوتی ہیں جن کی رو سے وہ قانون جائز اور درست نہیں معلوم ہوتا لیکن کبھی بھی اُن استثنائی شکلوں کی وجہ سے قانون کو ناجائز قرار نہیں دیا گیا ورنہ تو پھر معاشرے کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا اور ہر طرف لاقانونیت کا دور دورہ ہوتا، اور چونکہ قانون کا تعلق کسی شئے کے ان حالات سے ہوتا ہے جو اس سے اکثر اور بیشتر رونما ہوتے ہیں لہٰذا کوئی قانون حقیقی معنوں میں کلی نہیں ہوتا بلکہ ہر قانون عمومی اور اکثری ہوتا ہے۔ اس مسلمہ اور متفق علیہ اصولی بات کو سامنے رکھتے ہوئے اس تیسری دلیل پر نگاہ ڈالئے تو اس کا مہمل اور غلط ہونا خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اس تیسری دلیل کا مطلب اردو میں بیان کیا جائے تو اس کی صورت یہ ہوگی:

"چونکہ بعض دفعہ خاص حالات کی وجہ سے کارخانے اور عمارت کی آمدنی کا سلسلہ رک جاتا ہے مثلاً مالکِ عمارت کو کوئی کرایہ دار نہیں ملتا، اسی طرح مالکِ کارخانہ کو خام مواد نہیں ملتا یا کام کرنے والے کاریگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مزدور نہیں ملتے یا بازار میں تیار مال کی مانگ اور کھپت نہیں ہوتی لہٰذا کام بند ہو جانے سے آمدنی کا ریلا بند ہو جاتا ہے اور اس کے پاس کوئی دوسرا مال بھی نہیں ہوتا، اب اگر اس پر زکوٰۃ واجب ہو تو وہ بے چارہ کہاں سے ادا کرے گا، اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ عمارت اور کارخانے کا کچھ حصہ فروخت کرکے اس کی رقم سے زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے تو اس صورت میں اس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ چیز منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ اپنے بندوں کے لئے دشواری نہیں آسانی چاہتا ہے۔ "یُرِیدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ"۔ بالفاظ دیگر منطقی اسلوب سے اس دلیل کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے "اگر عمارت اور کارخانے کے سرمائے پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے تو بعض مقامات میں اس کے مالک کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے دشواری اور تکلیف میں پڑیں۔ لہٰذا مذکورہ سرمائے پر زکوٰۃ عائد کرنا درست نہیں۔"

اس دلیل میں محترم قرضاوی صاحب نے عمارت اور کارخانے نیز ان کے مالک کی جو حالت بیان فرمائی ہے وہ بہت ہی کم کبھی وقوع میں آتی ہے ورنہ عام طور پر حالات دوسری قسم کے ہوتے ہیں چنانچہ اس کا اظہار خود قرضاوی صاحب کے ان الفاظ "قد یتوقف فی بعض الاحیان" سے بھی صاف طور پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناب قرضاوی صاحب نے عمارت اور کارخانے اور ان کے مالک کے عام اور کثیر الوقوع حالات کی بجائے ایک نہایت قلیل الوقوع اور شاذ و نادر حالت کو قانون کی بنیاد بنایا جو اصولاً غلط ہے۔ کیونکہ قانون میں کسی شئے کے ان حالات کا اعتبار ہوتا ہے جو اکثر و بیشتر اس میں پائے جاتے ہیں اس کے شاذ و نادر حالات کا اعتبار نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ اس دلیل کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ اگر اس دلیل کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس صورت میں بھی عمارت اور کارخانے کے سرمائے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے جب ان کے مالک نے ان کو فروخت کرنے کی غرض سے خرید رکھا ہو کیونکہ اس صورت میں بھی بعض دفعہ ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ عمارت اور کارخانے کو کوئی خریدنے والا نہیں ملتا اور اس کے پاس کوئی دوسرا اور مال بھی نہیں ہوتا، لہٰذا ایسی حالت میں اس کے لئے زکوٰۃ ادا کرنا سخت مشکل و دشوار ہوتا ہے۔ حالانکہ قرضاوی صاحب اس صورت میں نادری اور دشواری کا کوئی خیال نہیں کرتے اور فرماتے ہیں کہ اس عمارت اور کارخانے کے سرمائے پر بلحاظ قیمت زکوٰۃ واجب ہے۔ بہرحال اس کے مالک کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس دوسری صورت میں عسر و دشواری کے باوجود مکان اور کارخانے پر زکوٰۃ واجب ہو سکتی ہے تو پہلی صورت میں اس پر کیوں نہیں ہو سکتی؟ آخر اس کی عقلی وجہ کیا ہے؟ بالفاظ دیگر مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو کہ جس عسر اور دشواری کی وجہ سے آپ پہلی صورت میں عمارت اور کارخانے کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ جب وہی عسر اور دشواری دوسری صورت میں بھی موجود ہے تو پھر آپ اس دوسری صورت میں عمارت اور کارخانے کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کیوں نہیں قرار دیتے، آخر اس فرق کی عقلی وجہ کیا ہے۔؟

نیز غور کرنے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دلیل میں محترم قرضاوی صاحب نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جو زکوٰۃ کے نفس وجوب اور وجوب ادا کے مابین پایا جاتا ہے۔ ورنہ وہ وہ دشواری محسوس نہ فرماتے جس کی وجہ سے انہیں زیر بحث مال کو زکوٰۃ سے خارج کرنا پڑا۔ فقہا رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ بعض صورتوں میں ایک شخص پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی ادائیگی اس وقت تک ملتوی رہتی ہے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہیں ہو جاتا، یعنی شرعاً اس سے ادائیگی کا مطالبہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس کی ادائیگی کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال وہ قرضہ ہے جو ایک تاجر کا مال تجارت کے بدلے میں کسی کے ذمہ پر لازم ہو جاتا ہے۔ ایسے قرضے کے لئے فقہ میں دین قوی کا لفظ ہے۔ ایسے قرضے کی رقم پر بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ادائیگی کا مطالبہ اسوقت ہوتا ہے۔ جب رقم وصول ہو جائے، مثلاً ایک تاجر نے کسی کو ایک ہزار روپے کا مال ادھار پر دیا اور یہ رقم پانچ سال کے بعد وصول ہوئی تو اس رقم پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لیکن وصول ہونے سے پہلے اس کی ادائیگی کا مطالبہ ملتوی رہتا ہے وصول ہونے پر پانچ سال کی زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے زکوٰۃ واجب تو ہوتی ہے لیکن اس کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، اسی طرح اگر اس حالت میں جو قرضاوی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش فرمائی ہے۔ عمارت اور کارخانے کے سرمائے پر زکوٰۃ تو واجب ہو لیکن اس کی ادائیگی اس وقت تک مؤخر رہے جب تک کہ مالک ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائے تو اس میں وہ مشکل اور دشواری پیش ہی نہیں آتی جس کی بنا پر قرضاوی صاحب نے مذکورہ سرمائے کو زکوٰۃ ہی سے خارج کر دیا ہے۔

محترم قرضاوی صاحب کی چوتھی دلیل بھی پہلی تین دلیلوں کی طرح فہم و تفقہ کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتی، اگر فقہ اور فقاہت اسی کا نام ہے جو ان دلیلوں میں پائی جاتی ہے۔ تو پھر ان لفظوں کا سابقہ معنی و مفہوم یکسر بدل دینا چاہئے۔

بہرحال اس چوتھی دلیل میں جو اصل بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ اگر عمارتوں اور کارخانوں کے سرمائے پر ہر سال قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ تسلیم کر لی جائے تو اس میں عملی طور پر بڑی دقتیں اور دشواریاں ہیں وہ اسطرح کہ زکوٰۃ کے تعین کے لئے ہر سال ان کی قیمت کا اندازہ لگانا پڑے گا۔ تاکہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ نکالی جا سکے۔ اور یہ ہر سال ان کی قیمت کا اندازہ لگانا بڑا مشکل اور دشوار کام ہے۔ کیونکہ ایک طرف مسلسل استعمال ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہنے سے ان کی قیمت روز بروز گھٹتی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف جس طرح خارجی حالات واسباب کے تحت دوسری اشیاء کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں۔ اسی طرح عمارتوں اور کارخانوں کی قیمتیں بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ لہذا ہر سال ان کی قیمتوں کا تخمینہ لگانا نہایت مشکل مسئلہ ہے جس کو اس فن کے خصوصی ماہرین ہی حل کر سکتے ہیں جو بعض دفعہ ملتے ہی نہیں اور ملتے ہیں تو ان کی عمارت سے زیادہ اٹھانے کے لئے خرچہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اس کھڑاگ اور کھکھیڑ سے بچنے کا اچھا طریقہ یہی ہے کہ سرے سے عمارتوں اور کارخانوں کے سرمائے پر زکوٰۃ تسلیم ہی نہ کی جائے، گویا نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

اس دلیل کو پیش کرنے والے جناب قرضاوی صاحب اپنی پہلی دلیل کے آخر میں لکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص عمارتوں اور کارخانوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے تو اس شکل میں ان عمارتوں اور کارخانوں پر ہر سال قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ حالانکہ اس شکل میں بھی وہ تمام دقتیں اور دشواریاں موجود ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے زیر بحث عمارتوں اور کارخانوں کو زکوٰۃ سے خارج کیا ہے۔ لہذا ان دقتوں اور دشواریوں کا جو حل قرضاوی صاحب کے نزدیک اس دوسری شکل کے لئے ہو سکتا ہے۔ وہی حل بعینہ زیر بحث شکل کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں مطلب یہ کہ جو مکان اور کارخانے فروخت کرنے کی غرض سے خریدے اور متعین کئے گئے ہوں سب کے نزدیک ایسے کارخانوں اور مکانوں پر ہر سال بلحاظ قیمت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ ہر سال جب ان پر زکوٰۃ کا تعین ہوگا تو ہر سال لازماً ان کی قیمتوں کا تخمینہ کرنا پڑے گا اور اس میں وہ تمام دشواریاں ضرور پیش آئیں گی جن کا چوتھی دلیل میں ذکر کیا گیا ہے لیکن چونکہ ان کی زکوٰۃ ادا کرنا بہر حال ضروری ہے لہذا ساری دشواریوں کے باوجود کسی نہ کسی طریقہ سے ان عمارتوں اور کارخانوں کی قیمتوں کا تعین کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کس عمارت اور کارخانے پر کتنی زکوٰۃ واجب الاداء ہے۔ تو جس طریقہ سے ان عمارتوں اور کارخانوں کی قیمتوں کا تعین ہوگا اسی طریقہ سے زیر بحث عمارتوں اور فیکٹریوں کی قیمتوں کا بھی تعین ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں آج کی دنیا میں عمارتوں اور کارخانوں کی مالیت وقیمت کے تخمینے کا مسئلہ کچھ بھی مشکل مسئلہ نہیں خصوصاً ان ممالک میں جن کا معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہے ان ممالک میں حکومتیں اپنے سرمایہ دار شہریوں سے مختلف ناموں سے مختلف ٹیکس وصول کرتی ہیں جیسے انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، دولت ٹیکس وغیرہ، پراپرٹی ٹیکس یعنی جائیداد ٹیکس کی تشخیص کے لئے جائیداد کی قیمت و مالیت کا اندازہ لگانا ضروری ہوتا ہے اسی طرح سرمایہ ٹیکس کے تعین کے لئے کارخانوں وغیرہ کی مالیت کا جاننا ضروری ہوتا ہے لہذا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے لئے باقاعدہ اصول وضوابط بنا دئے گئے ہیں جن کی روشنی میں آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت اس عمارت اور کارخانے کی مالیت اور قیمت کتنی اور کیا ہے۔

اور چونکہ اسلام یہ ذمہ داری حکومت کی قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے سمجھ دار وتجربہ کار کارندوں کے ذریعے زکوٰۃ کی تشخیص اور وصولی کا انتظام کرے لہذا حکومت اپنے خصوصی ماہرین کے ذریعے با آسانی یہ تخمینہ لگا سکتی ہے کہ اس وقت کس عمارت اور کس کارخانے کی کیا مالیت اور کیا قیمت ہے۔ مطلب یہ کہ یہ کام افراد کے لئے مشکل ہو تو ہو لیکن حکومت کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح یہ بھی بالاتفاق جائز ہے کہ حکومت زکوٰۃ کی آمدنی میں سے کارندوں کو ان کی خدمات کا معاوضہ دے سکتی ہے۔ لہذا حکومت کے لئے یہ بھی کچھ مشکل مسئلہ نہیں۔

اور پھر بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ قرضاوی صاحب ایک طرف زیر بحث سرمائے کو زکوٰۃ سے خارج کر کے زکوٰۃ کی آمدنی میں کروڑوں روپیہ کی کمی کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اس چوتھی دلیل کے آخر میں لکھتے ہیں:

ان کل هذا يقتضي جهودا ونفقات تنتقص اخيرا من حصيلة الزكاة۔ حضرات علماء کرام اس عبارت کو غور سے پڑھیں اور اس ذہنی کیفیت کا اندازہ لگائیں جس میں محترم قرضاوی صاحب مبتلا ہیں۔ اس عبارت کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ زیر بحث عمارتوں اور کارخانوں کی قیمت اور مالیت کا تخمینہ لگانے کے لئے ماہرین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں خرچہ اٹھانا پڑے گا۔ اور اس سے زکوٰۃ کی آمدنی میں کمی واقع ہو جائے گی، لہذا ان عمارتوں اور کارخانوں پر زکوٰۃ ہونی ہی نہیں چاہئے۔ بتلائیے اس سے زیادہ کفایت شعاری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ انسان ایک فیصد نقصان سے بچنے کے لئے سو فیصد کو ترک کر دے،

میں سمجھتا ہوں میں نے مختصر طور پر قرضاوی صاحب کی چاروں دلیلوں کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دلیلوں میں کتنی اور کیسی نقاہت ہے اور ان سے وہ مدعا ثابت ہوتا ہے یا نہیں جس کے لئے یہ دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ چنانچہ ابھی ان چار دلیلوں کے بعد آخر میں بطور نتیجہ قرضاوی صاحب نے جو لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محترم قرضاوی صاحب خود بھی اپنے دلائل سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں، وہ عبارت یہ ہے:

لهذا نرى ان الاولى ان تكون زكوة التجارة والمصنع ونحوهما في غلتها۔ مذکورہ دلائل کی وجہ سے ہماری رائے یہ ہے کہ بہتر یہ ہوگا کہ زکوٰۃ عمارت اور کارخانے کی آمدنی پر ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ اگر قرضاوی صاحب اپنے دلائل ہی کو صحیح اور اپنے موقف ہی [illegible] لفظ اولیٰ کی بجائے لفظ صحیح اور حق استعمال فرماتے، لفظ اولیٰ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرضاوی [illegible] دوسرے موقف کو جس کی رو سے زیر بحث عمارتوں اور کارخانوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، غلط اور باطل نہیں سمجھتے بلکہ اس کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ البتہ اپنے موقف کو اس کے مقابلہ میں بہتر سمجھتے ہیں، لہٰذا قرضاوی صاحب ان علماء حضرات سے موافقت نہیں رکھتے جو مذکورہ سرمائے پر زکوٰۃ کی رائے کو قطعاً غلط اور باطل سمجھتے ہیں، اور اس پر سختی سے مصر ہیں کہ مشینی سرمائے پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ ■■

© rasailojaraid.com